)حقوق طبع محفوظ ہیں(

شیعہ نقطہ نظرسے

**اِسلامی سیاست**

**اَزُقَلَمْ حَقِیقْتِ رَقَمْ**

**یس المفسرین فخُرالمحتققین علّامہ حسین بخش مجہتُدالعَصر**

**نی سَرپَرسْت جامِعَہ علْمیہٗ بابُ النّجف جاڑا ۔ ضلع ڈیْرہ اِسمْاعیل خانٗ**

**ناشر :۔  
دارالنَّجَفْ دریا خان ضِلع میانوالی**

**-------------**

**تعداد -----------------------------ایکہزار**

**اوّل------------------------------ بار**

**شاہین پریس سرگودھا۔ ----------------------مطبع**

**محمد شفیق سرگودھا------------------------- کاتب**

**مکتبہ انوارالنَّجف در ضلع میانوالی -------------- ---- مکتبہ**

**------------------------------------قیمت**

**تاجران کتب سے خاص رعایت**

**اَ ھْداء**

میں اپنی اس پیش کش کو حضرت حجتہ العصر قائم آل محمدﷺ کی بار گاہ امامت میں بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ اور اس سے حاصل ہونے والے انعام واکرام کو اپنی الدہ ماجدہ مرحومہ کے ایصال ثواب کےلئے صدقہ جاریہ قرار دیتا ہوں۔ قارئین کرام سے بھی مرحومہ کےلئے فاتحہ کےلئے اور دعائے بخشش کی امید رکھتا ہوں۔

حُسین بخش بقلمہٖ

فہرست کتاب اسلامی سیات

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
| --- | --- | --- | --- |
| 78  83  90  94  100  101  105  106  113  116  117  119  120  127  129  133 | عورت و مرد میں مساوات  پردہ کی حقیقت  اقوام گزشتہ کےواقعات درس عبرت میں  مساوات کا انجام  بےراہ روی و بے انصافی  دولت و علم میں اقتدار کی کشمکش  مساوات محمدیؐ  اسلامی احکام میں مساوات  عدل اصولی و عدل فروعی  صلہ رحمی  نظر و فکر  نظام مملکت میں غیرعادلانہ روش  مرکزی حکومت  اعتقاد نّبوت  کیا اسلامی سیاسی مسائل وحی کے تابع تھے  سربراہ مملکت اسلامیہ | 6  7  10  15  19  23  28  33  38  41  43  52  54  61  63  67  70  75 | پیش لفظ  النسانی ضابطہ حیات کی ضرورت  ایک عام فہم اندازِ فکر  جسمِ و رُوح  نظریہ حیات توحید سے بغاوت  افراط و تفریط  دعوتِ اسلام  نظریہ توحید  نظریہ قیامت  قیامت حق ہے  اللہ کی حاکمیّت  وجودِ خالق پر ایک دالیل  اسلامی مساوات  عدل و انصاف  عدل کی اقسام  ظلم وجود کا انجام  مساوات کا غلط تصّور اور اس کا حل  مساوات کے نقائص |
| 194  198  201  203  206  211  212  215  216  219  222  226  228  230  231  232  242  247  252  255 | صفتِ سبقت ایمانی میں برتری  فضائل عصمابہ میں افراط  حدیث سازی کا دَور  حضرت علیؑ پر سبّ وشتم  حق کو دبانے کی سازش و کوشش  حق کا بول بالا  حق کا علم بلند  ملوکیّت کہاں سے آئی  فلک کج رفتار کی نیر نگیاں  نص کی ضرورت کیوں ہے؟  ملوکیّت اور خلافت میں فرق  معیار خلافت اور نص  میعار کی موجودگی میں نص کی ضرورت  حضرت علیؑ نے نص پیش کیوں نہ کی؟  تحریک،اسلامی کاپنج نکاتی منشور  سیاست ملکیہ  خلافت اور سیاست  تحریکِ اسلامی کے پانچویں نکتہ سے انحراف  دور ِ حاضر میں اسلامی حکومت کا قیام  یقینِ محکم اور عمل ِ پیہم | 135  136  140  141  144  145  145  148  153  159  165  169  171  174  177  178  181  183  189 | انتخابی خلافت  میعارِخلافت  میعارِ فضیلت  صفت زہدد تقوی  صفت جہاد  جنگ ِ بدر  جنگِ احد  جنگِ خندق  جنگِ خیر  صفت علم والیقان  سبقتِ ایمانی  قرآن کا انتخابی نظریہ  طالوت کا انتخاب  تائید مطلب  ملوکیّت کا راستہ  برسر ِاقتدار طبقہ کے فضائل  موازنہ و دعوتِ فکر  صفت ِ جہاد میں موازنہ  صفتِ عِلم میں تقابل |

**پیشِ لفظ**

شیعان امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السّلام چونکہ اسلامی حکومتوں میں روزِ اوّل سے معتوب زندگی گزارنے کے عادی چلے آئے۔ حلم و حوصلہ اور رواداری اور درگزر ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی اور سواداعظم کے قلمکار حضرات نے ہر دور میں ان کی بےبسی اور کسی سےفائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے پاکیزہ مسلک کو غلط رنگ میں پیش کرنا اپنا وطیرہ بنالیا۔

دورِحاضر کے روشن خیال نوجوان چونکہ آبائی کورانہ تقلیدسے کسی حد تک آزاد ہوتے ہوئے اسلامی حقائق کی ٹوہ لگانے اور حق کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں لہذا ضرورت تھی کہ شیعی اصول و عقائد کو افکار جدیدہ کی افتاد طبع کے ماتحت ایسے قابل قبول انداز سے پیش کیا جائے کہ جہاں ایک طرف شیعہ نوجوان اپنے مذہبی حقائق کو پوری طرح ذہین نشین کرلیں وہاں دوسری طرف شیعہ دُشمن افراد کی غلط بیانیوں سے بھی وُہ باخبر رہ کر اُن کے اعتراضات کامنہ توڑ جواب دے سکیں۔ چنانچہ ہماری کتاب امامت و ملوکیت بھی اسی سلِسلہ کی ایک کڑی تھی، اور زیر نظر کتاب میں ہم نے ثابت کیا ہےَ کہ اسلامی تحریک کابنیادی منشور پانچ اہم نکات پر مشتمل ہے جن کو اصولِ خمسہ کہا جاتا ہے۔ توحید ، عدل نبّوت امامت اور قیامت اور یہی مذہب شیعہ کا بنیادی عقیدہ ہے ہماری دُعا ہے کہ خُدا تمام مسلمانوں کو حقیقتِ اسلام کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

(حسین بخش بقلمہٖ)

﷽

**اِنسانی ضابطئہ حیات کی ضرورت**

تمدن انسانی کے بقاء وارتقاء پیش نظر اجتماعی زندگی کو خوشگوار و پر سکون بنانے کےلئے ایسے ضابطئہ حیات یا ایسے آئینی نظام کی ضرورت ہے جو ہر حثیت سے جامع اور مکمل ہو ۔ اس میں نہ تو افراد کا حق آزادی سلب ہو اور نہ ان کو آواراگی و بے روی کی کھلی چھٹی ہو۔ جہاں ایک طرف ہر انسان اپنے حق آزادی کو استعمال کرتےہوئے ہر ممکن ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے وہاں معاشرتی حدود اور اخلاقی بندیشوں میں گھِر کر اپنے گردوپیش میں بسنے والوں کے حقوق آزادی پر ڈاکہ ڈالنے کی بھی جرا ت نہ کر سکے ۔ پس فرد فرد ہونے کی حیثیت سے اور قوم قوم ہونے کی حیثیت سے متعینہ حدود میں رہتے ہوئے اپنی آزادی ضمیر کے ساتھ انفرادی و اجتماعی زندگی کو کامیاب و کامران بنانے کی سعی میں مصروف ِعمل ہوں اور یہ تب ہوسکتا ہے کہ ہردانیٰ واعلیٰ اور چھوٹا و بڑا اپنے فرائض کا پُورا پُورا احساس کے اور اپنے اُوپر عاید شدہ پابندیوں کے آگے سر تسلیم خم کرلے ۔ ہر دور کے ارباب عقل و خردار اور ہر زمانہ کے حساس و دانشور اس گرہ کو اپنے تدّبر وتفکر کے ناخنوں سے کھولنے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہےلیکن کسی خوش کن نتیجہ تک پہنچے بغیر داعئی اجل کو لبیک کہتے ہوئے چل بسے۔

اس زمین کے ربؑ سکون پر انسانیت نے کئی نقوش اُبھرتےاور مٹتے دیکھے اور خود انسانیت کی کوکھ سے جنم لیکر ایسے افراد بھی ظاہر ہوئے کہ انسانیت کع حیوانیت کے تاریک ترین گڑھے میں دھکیلنا اور انسانیت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا ۔ پس وہ اپنی چندروزہ زندگی میں انسانیت کے وقار کے ساتھ کھیلتےکودتے با لآخر موت کے دامن میں منہ چھپاکر بے بسی سے عدم آباد کو روانہ ہو گئے اور انسانیت ایک بے بس اور قیدی پرندے کی طرح ظلم وتشدد کے جبروتی پنجرےمیں کراہتی رہی چیختی رہی لیکن نشئہ اقتدار میں مخمور انسان نمادرندوں نے اس کی آہوں پر کان ڈھرنے کو ہی فضول سمجھا۔

ایک وقت تھا کہ انسان کے سامنے ملکوتیت جھک گئی تھی پھر وہ وقت بھی آیا کہ انسانیت نمرود یت کا آلئہ کار بننے پر مجبور ہوگئی ۔ فرشتوں نے انسانوں کے وعناصراربعہ سے مخلوط امتزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلے دن سے اپنا نظریہ ، یہ پیش کیا تھا کہ یہ مخلوق فساداور خونریزی سے زمین کے امن وسکون کو تباہ کرے گی ۔ تو خدانے حضرت آدمؑ کی علمی برتری کے پیش نظر فرشتوں کو اس کے سامنے جھکنے کا حکم دے کر انہیں اپنے نظریہ پر خط نسخ پھیرنے کی فرمائش کی تھی ۔ اور فرشتوں نے بلاپس و پیذ حکم پروردگار کے سامنے سر جھکا لیا تھا ۔ اور یہ سب کچھ اس حقیقت پر دلیل قاطع ہے کہ انسانوں کو پروردگارنے ایک ایسا جو ہر رعطا فرمایا ہے جس کو کام میں لاکر انسان فسادی عناصر اور خونریز طبائع پر مکمل کنٹرول کرکے انسانیت کو اس کی ترقی کے معراج پر فائز کر سکنے پر قادر ہے۔

پس قندیل عقل ودانش اور فانوس علم و فراست کی روشنی میں عالی کردار اور بلند حوصلہ دانشور طبقہ قومی ملّی ملکی اور طبقاتی اجتماعی و انفراسی انسانی زندگی کابغور مطالعہ کرنے اور اس کے نشیب و فراز کے جملہ عوامل و دواعی پر مکمل احاطہ حاصل کرنے کے بعد اگر ایسے آئین و ضابطہ کے تشکیل پزاپنا قیمتی وقت خرچ کرے جو انسانوں کے انفرادی ع اجتماعی حقوق و حدود پر مشتمل ہو کہ نہ ان پر عمل کرنا انسانی آزادی پر ضرب کاری ہو اور نہ اُن کا نفاذ انسانیت کے تعطل کا موجب ہو تو ممکن ہے کسی حد تک نتیجہ اُمیدافزاثابت ہو۔

اس میں شک نہیں کہ انسانیت اپنی زندگی کے مختلف اَدوار میں تشدّد و ظلم کا آلہ کار بنتی رہی اور گونا گوں ہتھکنڈوں سے انسانیت کو خواہشات و جذبات کی تکمیل کے لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جاتا رہا یہی انسانیت نمرودیت کے سایہ میں رہی اور اس نے فرعونیت کا راج بھی دیکھا بلکہ پشت درپشت اور نسل درنسل ایسے حکمران آئے جنہوں نے اپنے آپ کو خدا سمجھا اور انسانیت کو اپنی کنیز قرار دیا۔

وہ انسانوں پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے جو باپ دادا کی طرف سے انہیں واراثت میں پہنچا۔ قہ ناپنے من مانے احکام بزورشمشیر منوا لیتے کسی کا اُن کےسامنے سرتابی کرنا تو درکنار ظلم کی چکی میں پستے وقت بھی کراہنا اور چیخنا ان کی طبع نازنین کےلئے ناقابل برداشت تھا بس انسانیت ان کے ہاتھوں میں کھلونا تھی جو چاہتے کر گزرتے کوئی پوچھنے والا نہ تھا ۔ اُن کے لئے نہ کوئی آئین تھا اور نہ کسِی قانون کے وہ پابند تھے بس ان کی خواہش نفس ہی سب کچھ تھی اور پوری انسا نیت ان کی بے بس غلام تھی۔ نیز جس حکمران طبقہ اس کی حکومت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا ۔ اسی طرح عامتہ الناس بھی غلامی کو اپنا مقدر سمجھتے تھے اور بدشاہ کے مزاج کے خلاف کرنا تو در کنار سوچنا بھی اپنے حق سے تجاوز کرنے لے مترادف جانتے تھے ۔

تاہم انسانیت کی ضمیر کی آواز کسی دور میں نہ دب سکی اور نہ دبائی جاسکی ۔ نمرود کے دربا میں جہاں اس کے تمرد کے پیش نظر کسی کو آنکھ اُوپر اٹھانے کی جرات نہ ہو سکتی تھی وہاں حضرت ابراہیم ؑ نےانسانیت کے خلاف کھلی جارحیت کو للکاراور نمرودیت کے مقابلہ میں الواہیت پروردگار کے پرچم کو بلند کیا اور واضع فرمایا کہ انسانوں پر حکومت کرنے کا پیدائشی حق کسی کو نہیں بلکہ حکومت مطلقہ اس ذات کو زیباہے جو سب کا خالق و رزاق ہے چنانچہ آپ نے انجام سے بے نیاز ہو کر توحید پرور دگار کو نمرود کے بھرے دربا میں ثابت کیا اور اپنے دلائل وبراہین اور ناقابلِ تسخیر ارادے سے نمرود کے تمرد کر کاک میں ملا کر رکھ دیا ۔ اسی طرح جب انسانیت کو فرعون نے اپنی باندی بنا رکھا تھا تو حضرت موسیٰ نے انسانیت کے حقوق کا علم بلندکیا اور اپنی پامردی سے آخر کار اُس انسان نمادرندے کے خونخوار چنگل سے کراہتی ہئی نیم مردہ انسانیت کو حق آزادی دلوانے میں کامیاب ہو گئے اور تاریخ ماضی کے اوراق پلالٹنے سے یہ بات روزِروشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ کسی بھی دور میں انسانیت کی صحیح ضمیر نے باطل کے سامنے سنگوں نہیں کیا۔

ایک عام فہم انداز ِ فکر

دیکھئے انسان کا جسم عناصر اربعہ آگ ہَوا مٹی اور پانی سے مرکب ہے اور عناصراربعہ کی باہمی جنگ ان کے تضاد کی بوجہ سے ناگزیر ہے ۔ اور خالق حکیم نے انسانی زندگیکے لئے عناصر اربعہ سے حاصل شدہ اخلاط کے مزاج کو ایک مناسب توازن کے ساتھ طبیت انسانیہ کے سپرد فرمایا ہے جس پر جسم کے اقوام کا انحصار اور دارو مدارہے بنابریں مزاج کے فساد کا نام بیماری اور اس کی صحت کا نام رتندرستی ہے اور ہر انسان فساد اور صحت کی دونوں حالتوں میں پابند ہے اور تادمِ زیست ان کی متبادل آمدورفت کی آما جگاہ ہے --- --- جب مزاج میں فساد رونما ہوتا ہے تو طبیت خودبخود آ گا ہ ہوکر دماغ بیدار ہو اور اپنے فرائض سے خبردار ہو تو فوری اقدام کر کے ہر ممکن کو شش سے مادہ فساد کا سراگ لگاتا ہے اور اس مدے کو ختم کرنے کے درپے ہوتا ہے ۔

جو باعثِ فساد ہے اور اِس سلسلہ میں وہ ہردانا و احکیم تک دسترس حاصل کرنے میں کوئی بخل نہیں کرتا لیکن اگر طبیعت میں تغافل ہو تو فسا ِ د مزاج کو لاپرواہی سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے پس وہ فساد اپنی جڑیں مضبُوط کرنے لگ جاتا ہے اور تدریجاً بڑھتے بڑھتے اس کا دائرہ عمل وسیع سے سے وسیع تر ہو کر پُورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لےلیتا ہے ۔ تب دماغ کو اس کے علاج کی فکر لاحق ہوتی ہے لیکن بہت کم خوش قسمت ہوتے ہیں ایسے افراد جو فساد کے ہمہ گیر ہونے کے بعاُس پر کنٹرول کر سکیں اور جسم کو پہلی سی تندرستی کی طرف پلٹا سکیں ۔ ورنہ اکثر و بشیتر حالات میں جسم انسانی کا ہمہ گیر فساد انسانی زندگی کی ناؤ کوڈبو کر رہتا ہے اور اگر بچ بھی تو اس کے سارے اعضا ء تازیست اس فساد سےضرور متاثر رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات اسکی زندگی موت سے برتر ہو جاتی ہے۔

طرح کہ فرداً فرداً ہر نسان اخلاط متضادہ کے توازن سے صحت و بیماری کی کشمکش میں زندگی کے ایام پُورے کرتا ہے ۔ اسی طرھ پورا معاشرہ انسانیہ جو انہی افراد کا مجموعہُ ہے ہر فتنہ و فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتا پس جسطرح ہرانسان میں فرداً فرداً مر ض کا مادہ بھہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک حساس طبیت ی موجودہے جو دل و دماغ کو فساد کے دُور کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور دماغ کا فکر اور دل کا عمل ملکر علاج کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور بزودیا بدیر فساد کا قلع قمع کرکے بدن کی تندرستی کا انتظام کر لیتے ہیں اسی طرح پُورے معاشرہ کے امن و سکون کو چلینج کرتا ہے لیکن اسی معاشرہ میں حساس طبیعتیں اور نباض ذہنتین بھی معاشرہ کا جزو لاینفک ہیں جو ہراُبھرنے والے معاشرتی فساد کا نوٹس لیتی ہیں ۔اور ارباب اقتدار اور صاحبان بست وکشاد تک اپنی رپورٹ پہنچاکر انہیں اس فساد کے علل واسباب معلوم کرنے کے دعوت دیکر اس کے مناسب و موزوں علاج کے طرف متنبہ کرتی ہیں ۔ اور جس طرح اعضائے انسانی میں ارادہ و شعور سےمحروم افراد کی فلاح و بہبود یا نشو و ارتقاء بلکہ پوری زندگی کے کملہ اعراض و احوال ان اعضاء کےرحم و کرم پر موقف ہیں جو ارادہ و شعور کی دولت سے مالا مال ہیں مثلاً ہاتھ پاؤں سینہ پیٹ آنکھ ناک ر کان وغیرہ اگر بیمارہوں تو یہ خود نہ اپنی تکلیف کےاسباب تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ان کے علاج کی تدبیر کر سکتے ہیں کیونکہ ارادہ و شعور سے خالی ہیں بلکہ دل ودماغ کے رحم و کرم پر ان کی صحت کا انحصار ہے جن کو پروردگار نے دولت اِرادہ اور شعور سے نوازا ہے اِسی طرح معاشرہ انسانیہ میں عامتہ الناّس افراد اگر مصائب و تکالیف میں گھر جائیں اور امن و سکون کی دولت سے محروم ہوجائیں تو اس کا علاج ان کے اپنے پاس نہیں ہوتا بلکہ وانشواران قوم اور نبا ضانِ ملک کا کام ہے ملک کے ان ارباب اقتدار تک رپورٹ پہنچاناجو اجتماعی زندگی کے توازن کو برقرار رہنے کی تدابیر کرسکتے ہیں۔ اور فساد کا سراغ لگا کر اس کا قلع قمع کر سکنے پر قدرت رکھتےہیں ۔ لیکن ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ انفرادی طور پر جسم واحد کے اندر رونما ہونے والے فساد کے علاج کی تدابیر اسی جسم کے اندر سے بسنے والے دل ودماغ تک محدود ہوتی ہے کہ اگر دل و دماغ اپنے مقام پر تندرست ہوں تو وہ نہایت اخلاص کے ساتھ پُورے اعضاء سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہوتےہیں کیونکہ ان کی زندگی اور موت باقی اعضاء کی زندگی وموت سے وابستہ ہوتی ہے ۔ نجلاف اس کے اجتماعی زندگی میں کرسی اقتدار کو سنبھالنے والے اگرچہ اسی معاشرہ کے ہی افراد ہوتے ہیں اور پُورے معاشرہ کے لئے اُن کا وجود دل و دماغ کی ہی حیثیت رکھتا ہے لیکن معاشرہ کے حق میں ان کے پاس وہ اخلاص نہیں آسکتا جو افراد میں موجودہے کیونکہ افراد میں اعضاء کی تکلیف دل و دماغ کو پوری طرح متاثر کرتی ہے بلکہ اعضاء سےسکون کا فقدان دل و دماغ کے سکون کو ختم کردیتا ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہ بات نہیں بلکہ نشہ اقتدار میں جن کے شب و درزگذرتے ہوں ان کے کانوں تک مصیبت زوہ افراد کی آواز پہنچتی ہی نہیںاور اگر پہنچ بھی جائے تو ان کو متاثر نہیں کرسکتی۔ اور اگر بالفرض کسی حد تک متاثر کو بھی دے تو اس کا اثر آنی وفانی ہوتا ہے البتہ اُن کا تاثر اس وقت باقی و دیر پا ہوتا ہے جب مصائب میں گھر ے ہوئے عوام کی کراہتی ہوئی آواز ایوانِ حکومت کی چولیں ہلا دے اور کرسئ اقتدار میں غیر معمولی اضطراب رونما ہو جائے۔ اور ایسے حالات میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے ہمہ گیر فساد کو دبانے کے لئے اس کے علاج کی طرف توجہ کرنے کی بجائے جھوٹے وعدوں سے عوام الناس کو مطمئن کر لیا جاتا ہے پس نہ علاج ہوتا ہے ۔ اور نہ فساد کی اصل جڑ کا سراغ لگانے کی زحمت گوارا کی جاتی ہے لہٰذا آتشِ فساد کی چنگاریاں دبنے کی بعد اُبھرتی رہتی ہیں اور بجھنے کے بعد سلگتی رہتی ہیں اور بالآخر انقلاب کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

حقوقِ آزادی سے محروم ظلم و جور کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی انسانیت نے ان مطلق العنان حکمرانوں تک بھی اپنی کراہتی ہوئی آواز پہنچائی جو اپنے آپ کو خدائی کا دعویدار کہہ کر انسانوں کی زندہ لاشوں پر قصرِ تشدد کی بنیاد رکھنا اور ناموسِ انسانیت کو اپنے جذبات و خواہشات کا کھلونا سمجھنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات ان کے انسانی حقوق کے تحفظ کے جائز مطالبات کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا گیا اور ظاہری تشدد سے ان کی آواز کو دبا دیا گیا لیکن اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا اور جب پھٹا تو انسانیت کش اور شرافت سوز اقتدار کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا کے رہا اور فلک نیلگوں کے سائے میں انسانی آزادی کا پرچم لہرا کے رہا۔

اسی طرح جمہوریت کے بہانہ سے برسر اقتدار آنے والی حکومتوں نے بھی جب کبھی انسانی آزادی کو کچلتے ہوئے اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے خواب دیکھے دُنیا والوں نے دیکھا اور آنے والے وقت نے اس منظر کو پیش کرنے سے کبھی بخل نہیں کیا۔ کہ مظلوموں کی کمزور آوازوں نے اور مصیبت کش طبقہ کی خاموش فریادوں نے اقتدار کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا کہ جس راستہ کو انہوں نے اپنے لئے پُرامن سمجھا تھا وہی ان کے لئے پر خطر بن گیا اور جس طرزِ عمل کو انہوں نے اقتدار کی پائیداری کا سبب سمجھا تھا وہی ان کے لئے زوالِ اقتدار کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

پس پورے معاشرہ انسانیہ کو اپنی اجتماعی زندگی کو کنٹرول میں لانے اور اعتدال پر رکھنے کے لئے ایسے ضوابط کے بغیر چارہ نہیں۔ جنہیں حاکم و محکموم امیرو غریب افسر و ماتحت اور طاقتور و کمزور کے لئے متعینہ حدود کی تشکیل ہو اور انسانی آزادی ضمیر کے زیر سایہ عدل و انصاف ہی ان کا معار ہو۔ اور جب تک آئین ِ عدل کو معاشرہ انسانیہ کا حکم نہ بنایا جائے گا یہ انسانیت امن و سکون کے لئے ترستی رہے گی اور زمینِ خدا فساد و خونریزیوں کی آماجگاہ بنی رہے گی۔

جسم و روح :

انسان دو اہم جزؤں کا مرکب ہے جسم مادی اور روح، سابق بیان میں واضح کیا جا چکا ہے کہ جسم مادی کے اعضاء میں مزاج کے عدم توازن کی بناء پر جو فساد رونما ہوتا ہے دل و دماغ کے فکروعمل سے اس کا ازالہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات ہرگز نظر انداز نہ کرنی چاہیئے۔ کہ عناصر مادیہ کی حیثیت مرکوب کی ہے اور روح کی حیثیت راکب کی ہے یعنی جسم سواری اور روح اس کا سوار ہے اور جس طرح جسم میں مزاج کا عدم توازن جسم کو فاسد کرتا ہے اسی طرح روح کا عدم توازن روح کے فساد کا باعث بنتا ہے پس صرف جسم کی تندرستی ہی انسان کی تندرستی نہیں بلکہ تندرست انسان وہ ہے جو جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے تندرست ہو۔

جس طرح طبیعت ِ انسانیہ اعضائے مادیہ کی مادی بیماریوں کو بھانپ کر دماغ کو اس کی اصلاح پر آمادہ کرتی ہے اسی طرح روح کی بیماریوں کے سمجھنے کےلئے اللہ نے وجود انسانی کے تاریک مادہ میں قندیل روشن فرمائی ہے تاکہ روح کی بیماریوں اور کمزوریوں کا سراغ لگایا جا سکے۔ اور اس کا تعلق ہر عضو سے جُدا گانہ نوعیت کا ہے۔ مثلاً آنکھ کی مادی بیماری الگ ہے اور روحانی الگ، کان کی جسمانی بیماری اور ہے اور مادی اور، اور اسی طرح زبان کی مادی تکلیف الگ اور روحانی الگ ہے۔

وعلی ھٰذا القیاس

پس جہاں مادی امراض کا علاج سوچنا اور کرنا دل و دماغ کا کام ہے اسی طرح روحانی امراض پر کنٹرول کرنا بھی انہی کا کام ہے۔ ورنہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی کے درمیان کوئی فرق نہ رہے گا، اور جس طرح جسمانی بیماریوں کے الگ الگ نام ہیں۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کے بھی الگ الگ نام ہیں مثلاً روحانی بیماریوں کی تعبیر یہ ہے کفر شرک نفاق حسد بغض کینہ غضب حرص ہوس حرام خوری خود پسندی خود غرضی تکبر ، تجبر ، ظلم جور جھوٹ مکر عذر اور جملہ وہ صفات جو صحیفہء انسانیت پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان امراض کی طرف متوجہ ہو کر ان کا علاج صرف شخصی فائدہ تک محدود نہیں بلکہ پورے معاشرہء انسانیہ میں سکون و اطمینان کا فقدان اسی بیماری کا نتیجہ ہے اور جس طرح روحانی بیماری ایک انسان کو خطرناک حد تک واجب الاجتناب بنا دیتی ہے اسی طرح اگر پُورا معاشرہء انسانیہ اسی قسم کی روحانی بیماریوں سے دوچار ہو تو پوری سطح ارضی کو امن و سکون سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

پس اس مقام پر دانشور طبقہ اگر خاموش تماشائی بنا رہے تو کیونکر اور اسے برداشت کرے تو کیسے؟ اور روح کی مذکورہ امراض سے شفا پانے کے بعد ان کے متبادل اچھے اوصاف کی جستجو انسانیت کا طرہء امتیاز ہے اور وہ یہ ہیں۔ مثلاً ایمان، ایقان اسلام شرافت امن پسندی دیانت، امانت رافت عدل انصاف حلال خوری رواداری خشوع خضوع درگذر قناعت رحم کرم سچ مروت شرم و حیا و علیٰ ھٰذا القیاس جملہ وہ صفات جو وقارِ انسانیت کی ضامن ہیں اور معاشرہ کے سکون و اطمینان کا پیش خیمہ ہیں۔

اب اربابِ دانش کے سامنے صفاتِ رذیلہ سے بچنے اور اوصاف جمیلہ سے آراستہ ہونے کے دو رستے ہیں جو بالکل واضح اور عیاں راچہ بیان کی مصداق ہیں۔

۱۔ تعلیم ۲۔ قانُون

محکمہ تعلیم پر اس سے پہلے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ تعلیمی نصاب ایسا سُلجھا ہوا تجویز کریں جو انسان کی ابھرتی ہوئی نئی پود کو انسانیت کے صحیح مقام کے سمجھنے میں مدد کریں جو انسان کی ابھرتی ہوئی نئی پود کو انسانیت کے صحیح مقام کے سمجھنے میں مدد دے تاکہ اسی نظریہ ء کو لے کر وہ پروان چڑھے اور اسی کی ترویج و توسیع کیلئے میدان عمل میں قدم بڑھائے اور اس کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ عامہ میں بھی اسی نظریہ کی اشاعت ہو۔ اور قول و عمل سے انسانوں کو ان اعمال و کردار سے گریز کی دعوت دی جائے۔ جو غلط راستہ پر چلانے کے محرک و داعی ہیں اور اس کے علاوہ حکومت ایسے افراد کی ہمت افزائی کرے جو انسانیت کے وقار کی بلندی کے خواہاں ہوں تاکہ دوسروں میں رشک پیدا ہو۔

اور اس کے ساتھ ساتھ قانون کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ جو فرد انسانی شرافت کے دائرے سے قدم باہر رکھنے کی کوشش کرے اسے عبرت ناک سزا دے تاکہ دوسرے اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کے لئے درس عبرت ہو۔ اگر کسی معاشرہ میں اس قسم کی قابلِ قدر ارکان محکمہ تعلیم اور منصف مزاج اربابِ قانون پیدا ہو جائیں۔ تو ایسا معاشرہ پوری انسانیت کے لئے اسوہ حسنہ کی تشکیل کرنیوالا ہوگا۔ اور اس کی دُنیا یقیناً جنت ہو گی کیونکہ ایسے معاشرہ میں اول تو فساد کو راہ نہ ملے گی اور اگر کبھی فساد نے سر اٹھایا بھی تو پورا معاشرہ اس کو نیست و نابود کرنے میں اپنا فریضہ ادا کرنے سے کوتاہی نہ کرے گا۔ پس ان کی دُنیا آغوشِ جنت ہوگی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِسی بگڑے ہوئے معاشرہ سے نکل کر چند افراد جب اقتدار کی کرسی تک پہنچ جائیں تو قبل از اقتدار جو انسانی قیود وہ اپنے اُوپر عائد سمجھتے ہیں بعد از اقتدار تو وہ اپنے آپ کو اُن سے بھی مکمل طور پر آزاد سمجھنے لگ جاتے ہیں کیونکہ وہ جب ہر قسم کی عیاشی کے دروازے اپنے سامنے کھلے دیکھتے ہیں تو بے تحاشا لپک کر اُن کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں ان میں ایک معمولی وقفے تک کے لئے بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ ہماری انسانیت کو تمام حیوانی زندگی سے کوئی امتیاز بھی حاصل ہے یا نہ ؟

وہ قبل از اقتدار اگرچہ اپنے دور کے موجودہ اقتدار کی بے راہ روی سے نالاں ہوتے ہیں اور عوام کو انقلاب کی طرف راغب کرنے میں یہی حربہ اُن کا سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر ہوتا ہے کہ اقتدار انسانیت کی خدمت کے لئے حاصل کرنا چاہیئے نہ کہ انسانیت کو اپنے جذبات و خواہشات کا کھلونا بنانے کے لئے لیکن اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ سب کچھ بھُول جاتے ہیں اور اپنے سابق صاحبانِ اقتدار سے رنگ رلیاں منانے میں سبقت حاصل کرنا ان کا مطمع نگاہ ہوتا ہے اور جنگ اقتدار کی جیت ہی ان کا مقصود ہوتا ہے پس ایسی صورت میں انسانی معاشرہ کی خرابیوں کا علاج کون سوچے اور معاشرہ میں سکون کیسے پیدا ہو؟ کیونکہ جب معالج خود کسی بد ترین اور موذی مرض کا شکار ہو جاتے تو مریضوں کا علاج کون کرے گا۔ نیز معالج جب خود بد احتیاط ہو تو مریضوں کو احتیاط کا درس کون دے گا۔ اور جب کسی خزانہ کا پہرہ دار سنتری خود چور ہو تو چوری کو روکنے والا کون ہوگا؟

نظریہء توحید سے بغاوت:

جب انسان نے اپنے نہاں خانہ وجود میں قندیلِ عقل کو روشن پایا تو اُسے تسخیرِ کائنات کے سہانے خواب دیکھنے نصیب ہوئے جس کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے اس نے شب و روز ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ اور کسی حد تک جزوی کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بعد اس کی ہوس تسخیر نے اور ترقی کی پس اس کو نفس نے یہ دھوکا دینا شروع کر دیا کہ میں ہی سب کائنات کا وہ در مقصود ہوں جس کے لئے یہ سب تخلیقی کارنامہ سرانجام دیا گیا ہے اور وہ یہ سمجھا کہ نہ میرے اُوپر کوئی حکومت ہے نہ حاکم اور نہ کوئی قانون ہے نہ مقنن پس نہ میرے لئے کوئی حد ہے اور نہ باز پُرس ۔ اور غلط فہمی میں پڑ کر جذب و دفع کے فطری تقاضوں کے ماتحت اس نے ہر مرغوب پر للچائی ہوئی نظر ڈالی اور اُسے اپنانے ککے لئے ہر ممکن ہتھکنڈا استعمال کیا اور یہ نا پسندیدہء خاطر سے اُس نے منہ موڑا اور اس سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدابیر کو اپنایا۔ پس ہر محبوب کو حاصل کرنا اور ہر مبغوص سے دور رہنا اس نے اپنا فطری حق سمجھا اور جس کسی نے اس کی تحصیل مقصود میں رہنمائی یا مدد کی اُسے دوست قرار دیا اور جس نے رکاوٹ ڈالنے یا رکاوٹ بننے کی کوشش کی وہ دُشمن ٹھہرا۔

عدل و انصاف کی دُنیا میں جو موفق ہوگیا اُس نے عیش و عشرت اور زندگی کی ہر سہولت پر اپنی اجارہ داری کا جھنڈا لہرا دیا اور اسے اپنا فطری حق سمجھ لیااور اپنے خلاف آواز اٹھانے والوں کو مستحق سزا قرار دیا۔ اور اسی جذب و دفع اور محبت و نفرت کے فطری تقاضوں کے ماتحت نہ اقتدار کی کُرسی کو کبھی سکون نصیب ہوا۔ اور نہ اُس کرسی کے سایہ میں بسنے والی عامۃ الخلق کو کبھی چین آیا۔

صاحبان اقتدار اِس کوشش اور فکر میں رہے کہ کرسی اقتدار چھین نہ جائے اور اقتدار کے مظالم اور اسے کے انسانیت کُش رویّے سے تنگ عوام اس فکر میں رہے کہ اس ظلم سے نجات کا مؤثر ذریعہ کونسا ہو سکتا ہے۔ جِسے اپنایا جائے؟ اور حاکم و محکوم کی اس ذہنی کشمکش سے ایک تیسرے طبقہ کو موقعہ ہاتھ آیا کہ اُس نے انتہائی عیاری و مکاری سے حکمران طبقہ کے عیوب برملا گننے شروع کر دیئے اور عوام کی مظلومیت پر مگر مچھ کے آنسو گرانا اپنی عادت بنالی۔ جس سے ظلم و تشدد کی چکی میں پسنے والے عوام کو اپنے مستقبل کی بھلائی کے خواب نظر آنے لگے۔ اور عوام بیچاروں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ظلم سہہ سہہ کر تھک جانے کے بعد انہیں آزادی کا چقمہ دینے والے ہر نئے شکاری کو پرکھنے کی ہوش ہی نہیں رہتی۔ ان کی نظریں موجودہ ظالم اقتدار کا تختہ اُلٹنے پر مرکوز ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات یہ نئے شکاری عوامی امداد سے انقلابی تحریک میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی ان کو ناکامی کا سامنا بھی ہوتا ہے پس اگر ناکامی ہو تو عروس اقتدار کے ناکام عاشق و لیلائے حکومت کے ناکام مجنوں اپنے شکار کے لئے عوامی تعاون حاصل کرنے کے لئے نئے جال تیار کرتے ہیں۔ اور نئے نئے ہتھکنڈے سوچتے ہیں۔ اور عوام بھی پہلے سے زیادہ خلوص کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ ظالم اقتدار سے گلو خلاصی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ اپنی شکست کا بدلہ لینا بھی ان کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ اور آخرکار بام مراد تک رسائی ہو جاتی ہے۔ لیکن اقتدار کے بدلنے سے عوام کی تقدید نہیں بدلتی بلکہ عوام کے سہانے خواب سب کے سب سراب کی طرح بے حقیقت بن جاتے ہیں اور انہیں ظلم کے ایک شکنجے سے نکلنے کے بعد اُس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ایک دوسرے شکنجے میں جکڑ دیا جاتا ہے اور پہلے کی بہ نسبت سختی اور گرفت کو بڑھا دیا جاتا ہے تاکہ تختہء اقتدار کو اُلٹنے کی جرأت نہ کی جاسکے۔ اِسی طرزِ عمل سے انسانیت امن و سکون کے لئے ہمیشہ ترستی رہی اور درندہ صفت لوگ بھیس بدل بدل کر ناموسِ انسانیت سے کھیلتے رہے۔ اور یہ مصیبت اور وبال صرف اس لئے ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو مافوق حاکم کی حکومت سے آزاد مان لیا اور اس کو باز پرس کا خطرہ محسوس نہ ہوا۔ اس ضمن میں خواہ صاحبانِ اقتدار امنِ عامہ کیلئے آئین تیار کریں یا نہ کریں، ظلم و جور کی چکی میں پسنے والی انسانیت کو نہ سکون مل سکتا ہے۔ اور نہ اس کو چین نصیب ہو سکتا ہے اس لئے کہ برسرِ اقتدار طبقہ کا تیار کردہ قانون و آئین زیادہ تر اقتدار کی منتقلی کے راستوں کو بند کرنے کے ذرائع پر مشتمل ہوتا ہے اور جن جزئیات کا تعلق رفاہ عامہ سے ہوتا ہے اس پر عمل کرنے والا معاشرہ نہیں ملتا۔ جبکہ حکومت کی غرض ہی صرف حکومت اور بالادستی ہوتی ہے نہ کہ خدمتِ انسانیت ۔ اور خدمتِ انسانیت کا جذبہء تو تب پیدا ہو سکتا ہے کہ انسانیت کے عمدہ صفات حکمرانی کے اندر بدرجہء اتم موجود ہوں اور ان کے دلوں میں انسانیت کا لاج ہو۔ ورنہ عیاش حکمرانوں سے اور باز پرس سے بے نیاز حاکموں سے عدل و انصاف کی تمنا رکھنا ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔

پس انسانیت کو سکون و آرام اور چین و اطمینان کا سانس لینا تب نصیب ہوگا۔ جب یہ تصور کر لیں کہ ہمارے اوپر ایک حاکم ہے اور اس کے سامنے ہم نے جوابدہ بھی ہونا ہے۔ پس جو قوانین بنیں وہ بھی اس نظریہ سے کہ حاکم بالا کی خوشنودی کا تصور موجود ہو۔ اور جو حکومت معرضِ عمل میں آئے وہ بھی اس نقطہ نگاہ سے کہ حاکم بالہ کی زیرِ نگرانی خدمتِ خلق کا فریضہ انجام دینا ہے۔ اور جس طرح ایوانِ اقتدار میں یہ نظریہ کار فرما ہو اسی طرح عوام الناس اور رعایا کے جملہ افراد بھی اسی نظریہ سے سرشار ہوں تب عدل و انصاف کو برتری حاصل ہو سکتی ہے اور ظلم وجور سے نجات حاصل کرکے پورا معاشرہ امن و سکون کا سانس لینے کے اہل ہو سکتا ہے۔

پس اس ساری معاشرتی خرابیوں کی واحد جڑ نظریہء توحید سے انحراف ہے اور حاکم و محکوم کے اندر بے چینی و بے اطمینانی کی واحد وجہ نظریہء توحید سے بغاوت ہے تو ثابت ہوا کہ وہ مضبوط قلعہ جو امن و سکون کی تلاش کرنے والوں کا واحد ملجاو ماوا ہے وہ قلعہ توحید ہے اور وہ نظریہء جو دانشورانِ عالم اور ارباب ِ فکرو نظر کے افکار و انظار کیلئے تمدن کے توازن کو بحال کرنے اور برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ ہے وہ نظریہ توحید ہے گویا یہ وہ واحد مرکز ہے جو امن عالم کے متلاشیوں کے لئے تگ و دو کی آخری منزل ہے اور ظلم و جور سے تھکی ہوئی انسانیت کی واحد آرام گاہ ہے اور جو انسان بھی علائق جسمانیہ اور خواہشاتِ نفسانیہ سے قطع نظر اپنے گردوپیش میں ذرا سا تامل کرے اس کے لئے نظریہء توحید کو اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کیونکہ جب تک ایک معمولی چیز اس عالم علل و اسباب میں بغیر بنانیوالے کے معرضِ وجود میں نہیں آ سکتی اور کوئی کام بغیر کرنے والے کے نہیں ہو سکتا تو اتنی بڑی کائنات کا وجود اس کا نظم و ضبط اس کی ترتیب و توسیع اس کی بقا و ارتقا اور اس میں کون و فساد بغیر کسی صائع حکیم اور فاعل مدبر کے ارادہ و اختیار کے کیسے رونما ہو سکتا ہے۔ پس جس علیم و حکیم خالق مدبر نے یہ سب تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور وہی اقتدارِ اعلیٰ کا واحد مالک ہے۔

افراط و تفریط :

ہر انسان چونکہ مرغوب سے محبت اور مکروہ سے نفرت کا فطری جذبہ لیکر پیدا ہوا ہے تو افراد کی کثرت کے بعد محبوب و مرغوب میں خواہشات و جذبات کا تصادم ضروری ہے کیونکہ کسی شیئی سے جب دو شخص متنفر ہوں تو دونوں اسے چھوڑ دیں گے اور ان میں باہمی جھگڑا نہ ہوگا اسی طرح اگر وہ چیز ایک کے لئے مرغوب ہو اور دوسرے کے لئے نفرت کی باعث ہو تب بھی باہمی تصادم نہ ہوگا لیکن اگر وہ شیئی دونوں کے لئے مرغوب و مطلوب ہوتو ہر دو کے جذبات میں ٹکراؤ کا ہونا لازمی ہے اور نتیجہ کے طور پر کمزور کو طاقتور کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اور اس صورت میں کمزور کے دلی جذبات و سکون نہ ہوگا اور نہ اس کی خواہش طلبِ مرغوب سے دست کش ہوگی بلکہ اُلٹا جذبات میں ہیجان اور خواہش میں تڑپ کا اضافہ ہوگا بس طاقتور کے متعلق عداوت کے جذبات اُبھریں گے اور ہر ممکن طریقہ سے وہ اسے راستہ سے ہٹاکر مطلوب تک رسائی کی کوشش میں اپنے شب و روز بسر کرے گا اور لمحہ بہ لمحہ اس کی عداوت میں اضافہ ہوگا اور موقعہ بموقعہ اس کی دلی عداوت کی خاموش چنگاریاں اشتعال پذیر ہوتی رہیں گی اور نتیجہ کے طور پر یا تو بالآخر عروس کامیابی سے ہمکنار ہوگا یا یاس و حسرت کی ناکام زندگی گزار کر آغوش موت میں جا آرام کرے گا پس ہر مرغوب و محبوب امر میں کمزور و طاقتور کے درمیان زور آزمائی کا نتیجہ یہی رہے گا۔

طاقتور طبقہ کے جذبات و خواہشات میں اگر کسی حد تک اعتدال کارفرما ہو تو کمزور طبقہ کے دل میں بھی طاقتور طبقہ کے متعلق نفرت کے جذبات میں کسی حد تک اعتدال کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ طاقتور طبقہ کے جذبات و خواہشات کے سمندر کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا وہ دنیا کی ہر اچھی شیئی کو اپنے لئے مختص سمجھتے ہیں اور ہر پیاری و عمدہ چیز پر اپنی اجارہ داری کو قائم کرنا اور رکھنا اپنا مادر زاد حق جانتے ہیں اور کمزور طبقہ کے جذبات کو مجروح کرنا بلکہ کچلنا اپنی شان و شوکت کی دلیل قرار دیتے ہیں اور یہی چیز تمدن کے توازن میں بگاڑ پیدا کرتی ہے جس سے معاشرہ کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر دنیا کی محبوب و مرغوب چیز میں ہر فرد اپنی حد ضرورت تک پابند ہو جائے اور اپنی خواہشات کو شتر بے مہار کی طرح آوارہ نہ ہونے دے پس اپنی ضرورت سے فالتو ضروریات زندگی سے کمزوروں کے لئے استفادہ کی گنجائش بھی رکھے۔

تو کمزور طبقہ کے دلوں سے جذباتی نفرت کی کمی کی امید ہو سکتی ہے ہے بلکہ جذبات محبت کے پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے اور غالبا ہمیشہ سے دستور یہی چلا آیا ہے کہ طاقتور طبقہ اپنی ضرورت سے زائد اشیاء کو بطور خزانہ کی جمع کرتا ہے ہے نہ اس سے خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ کسی صاحب نے ضرورت کو استفادہ کا موقع دیتا ہے۔

اور تو اور ہم نے بسوں اور گاڑیوں کی سیٹوں کے متعلق بسا اوقات جھگڑا اسی نوعیت کا دیکھا ہے ہے کہ دو کی سیٹ پر ایک بیٹھ گیا تو پاؤں پھیلا کر اس طرح بیٹھے گا جس طرح کے دونوں سیٹوں پر اس کی اجارہ داری قائم ہے پس جب اپنے سے طاقتور کو سیٹ کا مطالبہ کرتے دیکھا تو فورا پکڑ گیا لیکن جب کمزور نے مطالبہ کیا تو فورا پکڑ گیا اور کنڈیکٹر کی مداخلت کے بغیر تصفیہ نہ ہو سکا۔ اور اس تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ زائد از ضرورت چیز کو خواہ مخواہ اپنے قبضہ میں رکھنا اور دوسروں کو استفادہ سے روکنا ہر آدمی کے جذبات میں شامل ہے اور بہت تھوڑے لوگ ایسے بااخلاق ملتے ہیں جو اپنی ضرورت سے تجاوز نہ کرے ورنہ اکثریت ایسی بیماری میں ملوث ہے۔

طاقت کے گھمنڈ نہیں دور ماضی میں بعض سر پھرے شہنشاہوں کے دعوائے خدائی تک پہنچایا اور کمزور طبقہ سے انہوں نے اپنی ربوبیت منوالی اور پھر جو چاہتے رہے کرتے رہے ہے آجکل وہ طاقتور اگرچہ نہ رہے تو ان کو خدا ماننے والی رہی رعایا باقی رہی لیکن توراث سے صفات کے طور پر ان کا غرور اور گھمنڈ بعد میں آنے والے طاقتور کو ملا اور احساس کمتری ہر کمزور کے حصے میں آیا چنانچہ کے اگر کسی کو علم میں برتری حاصل ہے تو وہ علم کے گھمنڈ میں گوارا نہیں کرتا کہ کوئی سامنے اس کے برابر ہو کر بیٹھے۔ اور اگر زمیندار ہے تو مزار عین کا اپنے برابر بیٹھنا اپنی توہین سمجھتا ہے اس طرح ہر افسر کے دل میں ماتحت کے متعلق ہر دولتمند کے دل میں بے زر کے متعلق بلکہ ہر صاحب حیثیت کے دل میں بے حیثیت کے متعلق کسی بھی قسم کے جذبات کارفرما ہوتے چلے آتے ہیں ہیں۔ اور کمزور طبقہ میں احساس کمتری کے توارث کے ماتحت یہی بات ذہن نشین ہے کہ طاقتور کے پاس جائے گا اگرچہ چارپائی یا کرسی اس کے پہلو میں خالی پڑی ہو گی لیکن اس کی طرف نظر اٹھانے کی بھی اس کو جرات نہیں ہوتی بلکہ بلاتکلف زمین پر بیٹھ کر اپنی نیازمندی کے اظہار میں وہ فخر محسوس کرتا ہے۔

طاقتور میں رعونت تکبر اور کمزور میں احساس کمتری کے پیش نظر حقوق زندگی کے باہمی تقسیم افراط و تفریط کا شکار ہو گئی جس سے تمدنی توازن روز افزوں بگڑتا چلا گیا اور انسانیت بے راہ روی کا شکار ہوکر آوج رفعت سے قہرو مذلت کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی اور پوری زمین بے چینی و بے اطمینانی اور جھگڑے فساد کا گہوارہ بن گئی۔

بلند طبقہ نے پست طبقہ کی کمزوری اور احساس کمتری سے دھوکا کھایا بس وہ سمجھ بیٹھا کہ ہم ایک اعلی مخلوق ہیں اور ہمیں زندگی میں ہر قسم کی بے راہ روی کی مکمل آزادی ہے اور دنیا کی ہر عمدہ چیز پر ہماری ہی اجارہ داری قائم ہے لہذا پست طبقہ کو لوازم زندگی سے محروم رکھنا ہی ہماری شان عزت کی دلیل ہے بس اپنی ضروریات سے فالتو لوازم زندگی کو تلف کرنا گوارا کر لیا۔ لیکن کمزور کی خبر گیری کی طرف کسی وقت دھیان تک نہ کیا چنانچہ اپنی ضرورت سے زائد مکان کو تالہ بند کرنا پسند کر لیا لیکن کمزور کو سر چھپانے کی اجازت دینے میں اپنی توہین سمجھی اور اس طرح اپنی حاجت زائد کھانا کتوں کے آگے ڈال ناگوار کیا لیکن کسی فاقہ مست کو پیٹ بھرنے کی اجازت دینا برداشت نہ کیا اور اسی طرح ضرورت سے فالتو لباس کو تلف کرنا پسند کیا لیکن غریب اور نادار کو اس سے تن ڈھانپنے کی اجازت نہ دیں۔ وعلی ھزالقیاس

دنیا کے جس کے تحت ارضی میں غربت و افلاس کے بہتات ہو اس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ اللہ نے اپنا رزق اس قدر وسیع خلق فرمایا ہے کہ کوئی ذی روح بھوکا نہیں مر سکتا لیکن ذخیرہ اندوزی کو شوق دنیا داری کا گھمنڈ اور طاقتور طبقہ کی خود غرضی ہی اس نوعیت کے مصائب و مشکلات کا باعث بنتی ہے پس اگر وقت پر اجارہ داریاں ختم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ربع مسکون میں آباد ہونے والے انسان کہیں بھی بھوک اور افلاس کا شکار ہو۔ ایک طرف بلند و بالا آسمان رفعت محل ہیں تو دوسری طرف کچھ لوگ سرچھپانے کے لیے کچی جھونپڑیوں کے لئے ترستے ہیں ہیں ایک طرف ریشم مخمل اطلس کے اعلی ملبوسات کی فراوانی ہے تو دوسری طرف ایسے افراد کی کثرت ہے جو تن چھپانے کو کھدر کے معمولی کپڑے کے لیے ترستے ہیں اور ایک طرف اعلی مشروبات اور عمدہ کھانے اور شاہی سواریوں کی بہتات ہے اور دوسری طرف انہیں لوازم زندگی میں سے معمولی سے معمولی گزرا کے لئے ترستے برسنے والے دستِ نگر افراد بھی بکثرت موجود ہیں۔

اور ظلم بالائے ظلم یہ کہ اپنی فالتو ضروریات زندگی سے غریب پروری کرنا تو درکنار کمزور طبقہ اپنی کدید یعنی اپنی کمائی سے بھی اگر ضروریات زندگی کو مہیا کرے تو بڑے بڑوں کے نزدیک وہ بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے اور طاقت کے نشے میں مخمور انسان نما درندے یہ تک گوارا نہیں کرتے کہ کوئی کمزور ان کے سامنے اپنی حلال کمائی سے بھی دنیا کی ریل پیل میں ان کا شریک ہوں بس پیٹ بھر کر کھانے کے بعد کسی کی شکم پری کرنا تو درکنار کسی کمزور کا اپنی کمائی سے پیٹ بھر کر کھانا بھی ان کو گوارا نہیں ہوتا چنانچہ کمزور طبقہ کو حتی الامکان ہرقسم کی ضروریاتِ زندگی سے محروم کرنا وہ اپنا فطری اور پیدائشی حق سمجھتے ہیں بس ان کی تکلیف کا احساس کرنا تو درکنار ان کی مصیبت اور فاقہ مستی سے ان کو سرور محسوس ہوتا ہے ہے اور یہی وہ پرانے زمانے کی فرعونیت ہے جس نے غرباوطبقہ سے اپنی خدائی کے گیت سنے تھے۔

ایسے حالات میں کمزور طبقہ کے دلوں میں طاقتوروں کے حق میں محبت پیدا ہو تو کیونکر اور وہ ان سے وفاداری اور رواداری کی توقع رکھیں تو کیسے؟ بلکہ ایسے حالات میں کمزور طبقہ کے اندر جذبہ انتقام کا ابھرنا ضروری ہے اور اگر اس جذبہ کو دبایا جائے تو کب تک؟ اور اس جذبہ کو ختم جیا کیا جائے تو کیوں کر؟ اور جب تک طاقتور سے بے راہ روی ختم نہ ہو اور تمدن میں اعتدال پیدا نہ ہو تو بے چینی اور بدامنی ختم ہو تو کیسے اور سکون نفس اور اطمینان خط رونما ہو تو کیوں کر؟

**:دعوت اسلام**

فراعنہِ وقت اور نمرودان زمانہ کی سرکشیوں اور بدمستیوں کی بدولت جورو تشدد کے ظلماتی متلاطم سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی انسانیت جو مسلسل ظلم سہہ سہہ کر احساس کمتری کو اپنا مقدر سمجھتے ہوئے اپنے حق آزادی کے تصور سے بھی بیگانہ ہو چکی تھی ایک طویل غفلت کے بعد ان کو جگانے کے لئے مکہ مکرمہ کی سنگلاخ زمین میں اللّہ تعالٰی نے اپنا نمائندہ رسُول بھیجا۔ ایسی زمین جو انسان نما درندوں کا پوری زمینی آبادی میں مرکز و محور تھی کیونکہ اس خطہ کے دنیا دار اور تکبر و رعونت میں نمرود و فرعون وغیرہ سے کم نہ تھے غریبوں کا خون چوسنا ان کا محبوب مشغلہ تھا بے کسوں اور بے نواؤں کے جذبات کو کچل کر سرور محسوس کرنا ان کا نشان عظمت تھا۔ رہگزر مسافروں کو لوٹ لینا ان کا دل و بہلاوا تھا۔ قتل و غارت گری ان کا شیوہ تھا اور ظلم و تشدد بلکہ ہر قسم کی بے راہ روی بے حیائی اور بے شرمی ان کے لئے نشانِ جرات و شجاعت تھا تھا۔

پس ایسی زمین میں جو زمانہ جہالت میں ابوجہل کہلانے والوں کا مسکن تھی دعوت اسلام کو لے کر خدائی نمائندہ اٹھا اور چالیس برس کی اپنی متوازی ومعتدل زندگی سے پُر اثرو پُر رسوخ شخصیت کے اعلی کردار کے روپ میں اس طرح ظاہر ہوا کہ اس کا وجود کفر وجہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں اور زور و تشدد کی بےپناہ ظلمتوں میں نیر سعادت اور آفتابِ رحمت ثابت ہوا۔ جس کی عالمتاب روشنی تھوڑے عرصہ میں پورے خطہ عرب سے انسانیت سوز ظلمتوں کو کافور کر کے رہی اور ظلم و استبداد کی زمین کو عدل وانصاف کی آئینی حکومت سے معمور کر کے رہی۔

ان کی تعلیم میں دو مضمون نمایاں حیثیت رکھتے تھے ایک عقیدہ توحید اور دوسرا عقیدہ قیامت۔ چنانچہ قرآن مجید کی مکی آیتوں میں دعوت اسلامیہ کے منشور کی بنیادی پہلو صرف یہی دو ہیں تاکہ ایک طرف انسانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ ہمارے اوپر ایک حاکم ہے جو تمام کائنات کے کلی و جزوی امور کا واحد مالک ہے پس اسی کو ہی حکومت کا حق حاصل ہے اور دوسری طرف یہ ذہن نشین ہو کے انسان کی حیثیت عام حیوانوں جیسی نہیں کہ صرف زندگی کے چند روز گزار کر چلا جانا ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں بلکہ مرنے کے بعد ایک دن حساب کے لیے مقرر ہے اور دنیا میں کردہ اعمال کی باز پُرس اُس دن ہوگی۔

قرآن مجید کی مکہ میں نازل ہونے والی اکثر آیات انہیں دو مضامین پر مشتمل ہیں ہیں چنانچہ سورہ مومن سے لیکر سورہ احقاف تک جن صورتوں کو حوامیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ سب مکہ میں اتریں۔ ان میں دعوت اسلامیہ کا محور انہی دو اہم نظریوں کو قرار دیا گیا ہے تا کہ ہر طاقتور و کمزور اور امیرو غریب یہ سمجھ لے کہ ہم خود بخود پیدا نہیں ہوئے بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے اپنی اختیار و ارادہ سے ہمیں کسی مقصد کے لئے خلق فرمایا ہے اور درحقیقت پوری کائنات میں اقتدار کا واحد مالک وہی ہے اور اس کا اس میں کوئی شریک نہیں اور سب انسان خواہ امیر ہو یا خواہ غریب اسی ایک خدا کی مخلوق ہیں اور اسی ایک کا عطا کردہ رزق سب کھاتے ہیں لہذا اس کی خلق کردہ نعمات پر کسی کی اجارہ داری مخصوص طور پر قائم نہیں بلکہ تمام انسانوں کو خطاب کرکے فرمایا۔ خَلَقَ لَکُم مَّا فِی الَارضِ جَمیعًا (کہ میں نے تم سب کے لئے زمین کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے) لہذا ہر شخص کو اس کے منافع سے حسب ضرورت نفع اٹھانے کی اجازت ہے اور اپنی ضرورت سے زائد چیز کو بجائے اس کے کہ ذخیرہ اندوزی کرے۔

دوسروں کو استفادہ کا موقع دے تاکہ باہمی طور پر جذبہ منافوت کے بجائے جذبہ محبت پیدا ہو اور حسد و کدورت کی آگ بھڑک کر امن عامہ کی تباہی کی باعث نہ بنے بلکہ محبت و پیار قائم ہو تاکہ انسانی زندگی پُرامن اور پُرسکون ہو۔ اور عقیدہ توحید کو دلیل و براہین سے واضح کرنے کے بعد اور دنیا میں بھائی بھائی بن کر زندگی گزارنے کی دعوت کے بعد ہر جگہ یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے تاکہ تمہارے لئے ایک باز پرس کا دن بھی مقرر ہے کہ دنیا میں جو شخص حدود متعینہ سے قدم باہر رکھے گا اور ایک دوسرے پر ظلم و جور کا اقدام کرکے امن عام میں اضطراب و بے چینی کا باعث ہوگا اس کے لئے سنگین سزا جہنم کا دائمی جلیخانہ تیار کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دعوت ہے فرعون مزاج دولت مند طبقہ کے لئے برق قہر تھی اور ظلم وجور کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی عام انسانی آبادی کے لئے مژدہ جانفزا تھی پس جہاں اس دعوت کو سن کر انسانیت کا خون چوسنے والے متکبر مزاج طبقہ کے دلوں میں حسد اور غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض قریب ترین رشتہ داروں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن نہ گوارا کرلیا لیکن اپنی انسانیت سوز حرکات اور شرافت کش فسادات کو بدلنے کی جرات نہ کی وہاں دوسری طرف ظلم و جور سہہ سہہ کر احساسِ کمتری میں مبتلا کمزور طبقہ نے اپنی تاریک زندگی کے مستقبل میں انسانی آزادی کی روشنی کی جھلک دیکھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ انسانیت کے خفتہ قسمت کو جگانے والے انقلاب آفرین نظریہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگ گئے چناچہ آپ کے عقیدت مندوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

تشدد و آمریت کے انسانیت سوز ذرائع سے حکومت کرنے والے عیاش مزاج طبقہ نے اپنی سابقہ ظالمانہ روش کے ماتحت پہلے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظریے پر تشدد کے ذریعہ سے غالب آنے کی ناپاک جسارت کی چنانچہ گوناگوں اذیتوں سے حضور کی دل آزاری کی گئی گی جس کو آپ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور حضرت ابو طالب کی فہم و فراست اثرورسوخ ہمت و طاقت اور جرات و شجاعت کے پیش نظر اگر چہ آزادانہ طور پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نظریہ اسلامی کے پرچار سے روک تو نہ سکے لیکن زبان درازی اور طعنہ بازی سے حضور کے مشن میں رخنہ اندازی سے وہ کبھی باز نہ آئے کبھی آپ سے بائیکاٹ کبھی اسلامی نظریہ کو اپنانے والے غریب و مزدور طبقہ پر سختی اور تشدد اور کبھی اثنائے تبلیغ میں شور و غل مچانے کی حیا سوز حرکت ان کا دستور بن گیا کیا چنانچہ قرآن مجید نے ان کے طرز عمل کی حکایت اس طرح فرمائی ہے **قال الذین کافرون لا تسمعوا لہذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون**  ( کافروں نے آپس میں طے کر لیا کہ اس قرآن پاک پر کان نہ دھرو بلکہ دوران قرآت لغو حرکات کیا کروں شاید تم اس طرز عمل سے کامیاب ہو سکو ) جب دیکھا کہ ان میں کامیابی نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاذ اللہ کبھی شاعر کہنا کبھی جادوگر کہنا اور کبھی دیوانہ کہنا شروع کر دیا کیا تاکہ لوگ ان کی باتوں کو نہ سنیں اور کم از کم ان پر باور نہ کریں۔ لیکن وہ فطرت کے اس رد عمل سے غافل تھے کہ حق کی آواز کو آمرانہ تشدد اور ہنگامہ آرائیوں سے ہرگز نہیں دبایا جا سکتا۔

**دعوتِ اسلامی کا پہلا بنیادی نظریہ، نظریہ توحید**

دعوت اسلام کے منشور کا سب سے پہلا اور اہم نکتہ نظرئیہ توحید تھا جو معاشرہ انسانیہ میں اعتدال پسندی کی ترویج میں بنیادی حیثیت کا حامل تھا کیونکہ یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر طالبان حق و حقیقت کے افکارو انظار کے خطوط آکر ملتے ہیں اور یہی وہ واحد مقام امن ہے جہاں ظلم و استبداد کی چیرہ دستیوں سے تھکی ماندی انسانیت کو سکون کا سانس نصیب ہوتا ہے نیز یہ وہ ناقابل انکار حقیقت ہے ہے جس کے سامنے نے باطل پرستوں کے سب شرافت سوز منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں اور یہی وہ عظمت و جبروت کا مضبوط حصار ہے جس سے ٹکرا کر ہر دور کی فرعونیت نمرودیت اپنی موت آپ مر جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا باطل نواز اور انسان نما جانور اس مقدس نظریہ توحید کو اپنانے سے گھبراتا ہے اس لیے کہ تکبر صرف اسی کی ذات کو زیبا ہے ظالم اس لیے کہ اس سے ایک قادر مطلق کی بعض پرست سے اپنے ظلم کا انجام بھیانک معلوم ہوتا ہے ذخیرہ اندوز اس لئے کہ رازق و مطلق کی حکومت کے زیراثر اسے ناجائز ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری سے دست کشی اور اجتناب کرنا پڑتا ہے اور ایسے مواقع بہت کم فراہم ہو سکتے ہیں جن کی بدولت وہ دولت کی بے تحاشا فراوانی پر قادر ہو سکے۔ زبردست اس لئے کہ کہ اسے زبردست کو کچلنے اور اس کا خون ناحق چوسنے سے گریز کرنا پڑتا ہے چوروں ڈاکوؤں اس لئے کہ ایک دانا و بینا حاکم کی گرفت کے خطرہ کے پیش نظر انہیں اپنی پیشہ ورانہ عاداتِ بدکو ترک کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

اور حکمران اس لیے انہیں اپنی خواہشات یا آزادی چوڑ کر اللہ کے اقتدار مطلق کے سائے سرنگوں ہونا پڑتا ہے غرض یہ کہ ہر غلط کار انسان جس نے اسی چار روزہ زندگی کا سکون ہی اپنی آخری منزل سمجھ رکھا ہے اور اپنی خواہش کے فیصلوں کو ہی اس نے اپنی زندگی کے سفر میں مشعل راہ قرار دے رکھا ہے ہے وہ نظریہ توحید کے اپنانے سے کتراتا ہے اس میں اس کی موت نظر آتی ہے

صنادید قریش اور اکابر مکہ جو بے کسوں اور بے بسوں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے اپنے زمانہ کے درندہ صفت انسان تھے وہ اپنی مخصوص تقاریب و محافل میں حیات سوز اور شرافت کش عیاشانہ مزاج کا مظاہرہ کرتے تھے وہ اپنے دشمن کو قتل کرنے کے بعد مقتول کے کاسئہ سر میں شراب ڈال کر چسکیاں لے لے کر پینے میں قلبی سرور اور ذہنی سکون محسوس کرتے تھے کسی کمزور انسان کی طرف عزت و ناموس شرافت و غیرت اور وقار و حمیت کا منسوب ہونا ان کے لیے ناقابل برداشت تھا تھا کیونکہ وہ ان صفات پر باوجود درندہ صفت اور انسانیت کش رویہ کی اپنی اجارہ داری کا عقیدہ رکھتے تھے وہ ظلم کرنے کو شجاعت شراب نوشی کو سخاوت ہتک عزت کو جرات لوٹ کھسوٹ کو حمیت تلون مزاجی کو شرافت اور تکبر اور رعونت کو حق خود ارادیت قرار دیتے تھے وہ اپنی ہر بدعادت کو اپنے کمال زینہ سمجھتے تھے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کو اپنے حق میں ناجائز مداخلت سمجھتے تھے۔ پس غریب و نادار اور کمزور و ناتواں کی حیثیت ان کے نزدیک ایک عام حیوان کی سی تھی اور ان کی زندگی ان کے رحم وکرم کی مرہون منت تھی گویا وہ انسانیت کو اپنی کنیز اور شرافت کو اپنی باندی تصور کیے ہوئے تھے۔

ایسے حالات میں ان کا خدائے واحد کے لئے اقتدار اعلی کو تسلیم کرنا ایک ناشدنی عمر تھا اس لئے پہلے تو انہوں نے منت و سماجت اور چاپلوسی کی مکارانہ وعیارانہ ذرائع سے حضرت ابو طالب کی زبانی پیغام بھجوایا کہ اگر شادی کی ضرورت ہو تو ہم خاندان قریش کی حسین ترین شہزادی سے آپ کی شادی کرنے کو تیار ہیں ہیں اگر دولت کی خواہش ہو تو ہم اپنے جمع کردہ اموال سے حسب منشا آپ کی ہر ممکن کوشش کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہیں ہیں اگر حکومت کی حاجت ہو تو ہم بطیب خاطر آپ کو حق مان کر اپنے لئے رعایا ہونے کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہیں غرض یہ کہ آپ صرف لا الہ الا اللہ کے عقیدے کا پرچار چھوڑ دیں تو آپ نے انتہائی صبر و سکون اور عزم و استقلال کا مظاہرہ فرماتے ہوئے دو ٹوک جواب دیا اے عم نا مدار اگر یہ لوگ آسمانی رفعتوں سے چاند کو کھینچ لائیں اور میرے ہاتھ پر رکھ دیں اور چرخ چہارم سے آفتاب کو اتار کر میرے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیں یعنی صرف مکہ حجاز و عرب کی نہیں بلکہ آسمانی اقتدار کی کرسی بھی ان کے بس میں ہوں اور میرے حوالے کرنے کو تیار ہو جائیں آئی تب بھی میرا ناقابل تنسیخ اور اٹل فیصلہ یہ ہے کہ پورے عالمی و امکانی وظاہری اقتدار کو ٹھکرا سکتا ہوں لیکن پرچم توحید کو نہیں جھکا سکتا اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے اس منشور سے باز نہیں رکھ سکتی اور نہ میرا ضمیر خریدیا جا سکتا ہے اور نہ میری آواز حق کو دبایا جا سکتا ہے میں نے توحید کا پرچم اٹھایا ہے اسے فضا عالم میں لہرا کے رہوں گا اور رعونت اور تکبر کے متوالوں کی سرا اسی پرچم کے سامنے جھکا کے رہوں گا۔

اور میں نے جو قدم اٹھایا ہے سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے بس میرا قدم بڑھتا رہے گا اور حق و صداقت کی فضا عالم میں گونجتی رہے گی کفار قریش ہنے ہزار جتن کئے اور لاکھ چلے کئے کہ کسی طرح سے نظریہ توحید کو دبایا جائے اور شمع حق کو بجھایا جائے لیکن وہ دبنے کے بجائے دن بدن ابھرتا چلا گیا بجھنے کے بجائے چمکتا گیا گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا اور بگڑنے کے بجائے سنورتا گیا حتی کہ آسمانِ رفعت کے بلند ترین کنگرہ تک جا پہنچا پس فرعونیت و نمرودیت ذلت آمیز شکست سے ہم ہمکنار ہوئی کفر الحاد نے ہتھیار ڈال دیے اور انسان نما درندوں نے حکمِ توحید کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا جس کے نتیجے میں میں تشدد استبداد اور قہر و غلبہ کے طاغوتی شکنجوں میں جکڑی ہوئی بے بس انسانیت نے آزادی ضمیر کا پرسکون سانس لیا اور ایک طویل وقت انہوں نے ذلت آمیز زندگی سے نجات پا کر اسے پروقار وقت پر بہار لیل و نہار گزارنے کا موقع ملا۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مشن کی ترویج میں کبھی سہل انگاری کو جگہ نہ دیں اور نظریہ توحید کی سربلندی کے لیے کسی بڑے سے بڑے اور متکبر سے متکبر انسان کے لئے اپنے طرز عمل اور طریقہ بیان میں کبھی معمولی سی لچک بھی پیدا نہ کی کی چنانچہ ایک دفعہ کفار نے یہ خواہش کی کہ آپ بے شک اپنے نظریے کا پرچار کریں لیکن کم از کم ہمارے ساتھ اتنی رعایت کریں جن کے سامنے ہمیشہ جھکتے رہے ہیں ہمارے ان خداؤں کو توہین آمیز لہجہ سے یاد نہ کریں تو آپ نے بلاجھجک دو ٹوک جواب دیا کہ میں خدائے واحد کی دین کی ترویج و تبلیغ کے لئے آیا ہوں اور اسی کے حکم کا پابند ہوں تم میں سے کسی کی عزت کا روادار نہیں پھر تم جو چاہو جب چاہو چاہو مجھے اذیت دو میرے ساتھ فریب کرو میرے متعلق جی بھر کر غلط ملط پروپیگنڈا کرو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

جس اللّہ تعالی نے مجھے دکھی انسانیت کو ظلم و جور سے نجات دلانے کے لئے بھیجا ہے وہی میرا حافظ و ناصر ہے اور اسی پر میں پورا اعتماد رکھتا ہوں اس لئے ہر دور میں علمی توحید کے بلند کرنے والوں کو اس سلسلہ میں ہر بڑی سے بڑی قربانی پر آمادگی اور ہر سخت سے سخت مصیبت و آزمائش کے سامنے پامردی کی ضرورت ہے اہل شرک و بدعت کی ہنگامہ آرائیوں سے متاثر ہو کر گھبرا جانا نظریہ توحید کے علمبرداروں کا شیوا نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے سینکڑوں سال اہل شرک کی جانب سے دل دہلانے والے مصائب سے زبان درازیاں برداشت کیں اور جسمانی اذیتوں کی توحد نہ رہی کہ عین تقریر کے دوران سامعین کی خواہشات و جذبات کے خلاف جب توحید پروردگار کو بیان کرتے تو ہر طرف سے پتھروں کی بارش ہوتی ہے حتی کہ آپ پتھروں میں دب جاتے اور بارہا کی اس جان لیوا روح فرما تکلیف سہنے کے بعد بھی کسی وقت اپنے نظریہ میں لچک پیدا نہ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرودی اقتدار پرچم توحید کے بلند کرنے سے نہ روک سکا اور سزا کے طور پر انہوں نے آگ میں کود جانا منظور کرلیا لیکن علمِ توحید کو جھکانا گوارا نہ کیا اور حضرت موسی علیہ السلام نے فرعون جیسے مطلق العنان فرمانروا کو پیغام توحید سنایا اور کافی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد بعد دعوت اسلامی کے منشور کو عوام تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے اور دکھی انسانیت کے فریاد رس کی حیثیت سے انہوں نے امن و اطمینان اور عدل و انصاف کا انقلاب آفرین نظریہ پیش کیا اور اسی کو اپنی انقلابی تحریک کا منشور قرار دیا چنانچہ فرعونیت کا تختہ اقتدار الٹا بس ظالم و سرکش لوگوں کی روایت پانی میں ڈوب گئی اور مظلوم طبقہ کو آزادی آفس کا باعث عزت مقام نصیب ہوا اس طرح زمانہ جاہلیت کے غنڈوں سفاکوں ذخیرہ اندوزوں اور شرافت کش بے ضمیر انسان نما درندوں کی استبدادی رویے کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا انہیں اس ظلم و جور کی تیز و تند آندھی کے سامنے کھڑے ہونا اور اس بےپناہ طوفان بدتمیزی کا منہ موڑنا سہل نہیں تھا اور کفر و شرک کی ہمہ گیر نظریے کو چیلنج کر کے نظریہ توحید کا پرچار کرنا معمولی امر نہیں تھا لیکن حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خداداد بے پناہ قوت ارادی کے بل بوتے پر ظلم و جور کفروشرک بلکہ عالمی باطل قوتوں کو للکارا ذرا اور کفر و شرک کے تیز تر طوفان کے دھارے کے آگے کوہ کراں بن کر ڈٹ گئے اور نتیجہ کے طور پر کامرانی و کامیابی نے قدم چوم لیے اور دعوت اسلامی کا منشور نظریہ توحید مقبول عام ہوا پس جو انسان جب بھی ایمان کا ایمان کا اور پختگی ارادہ سے انبیاء سابقین اور خصوصا حضرت خاتم الانبیاء کے سیرت کو اپنے لیے اسوائے حسنہ قرار دے کر حق کا پرچم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے تو کوئی وجہ نہیں کہ عروسی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو اور یقین جانئیے یہ کہ عالمی مشکلات کا حل پرچم توحید کے تلے جمع ہوئے بغیر صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

**نظریہ قیامت:**

دعوت اسلامی حکومت کے منشور کا دوسرا اہم نکتہ نظر یہ قیامت ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب کائنات عالم کا تخلیقی کارنامہ اور اس کی بقاء و ارتقاء نیز اس کا نظم و ضبط ایک خالق و مدبر علیم و حکیم اور حیئ وقیوم کے ارادہ ہی حکمت کا عظیم شاہکار ہے تو یہ بات یقیناً بعید از قیاس اور خالی از حکمت ہے کہ اتنا بڑا نظام موجودات بلا مقصودبلا انجام اور اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوسکتا کہ اس نے انسان کو اپنے تابع فرماں رہنے کے لئے خلق فرمایا ہے **ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** ( اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں ) اور اس نے اپنی اطاعت کہ دواعی اور اپنی نافرمانی سے بچنے کے محرکات کا جابجا ذکر فرمایا چنانچہ اس نے اپنی نعمات و احساسات کو قرآن حکیم میں بار بار دہرا کر تمام انسانوں کو دنیا میں عبد بن کر زندگی بسر کرنے کی دعوت دی ہے اور اپنے فریضہ کو صحیح ادا نہ کرنے والوں کو اپنی گرفت سے خوفزدہ کرتے ہوئے اطاعت گزاروں کو اپنی جانب سے مزید انعامات کی پیشکش بھی فرمائیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بعض لوگ ازل تا آخر ظالمانہ گزار کر جاتے ہیں۔ لیکن ان کو اپنے ظلم کی سزا نہیں ملتی اور بعض لوگ مسلسل مظلومیت کے دن گزار کر دنیا کو خیرباد کہہ جاتے ہیں اور دنیا کی کسی عدالت میں ان کی بھی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ پس عقل اس مقام فیصلہ کرنے پر مجبور ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دن ایسا ضرور ہوں جس میں غلط کاروں کو غلطی کی سزا اور صحیح کردار لوگوں کو اپنی اچھائی کی جزائے خیر دی جائے۔ کیونکہ جس آئین و قانون کے بعد اس کی موافقت یا مخالفت پر باز پرس نہ ہو وہ قانون و آئین کالعدم سمجھا جاتا ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ سچ شرافت عدالت و انصاف حیا و شرم امانت و دیانت اور سخاوت وغیرہ صفات کی اچھائی خالق کائنات کی جانب سے فطرت سلیمہ انسانیت کو ودیعت کی گئی ہے اور اس کے مقابلہ میں جھوٹ کمینگی ظلم بے حیائی اور بے شرمی خیانت،بددیانتی اور بخل وغیرہ صفات بد کی برائی بھی خالق عالم کی جانب سے سہیل الفطرت انسان کو روز اول سے سمجھا دی گئی ہے بس جو انسان معرض وجود میں قدم رکھتا ہے وہ فطرت کے ان تقاضوں کو سمجھتا ہے اور اسے کسی کے مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جب بھی انسانی عقل خیر و شر کے امتیاز کے دو قوتیں اپنے اندر پاتی ہیں تو اپنے مقام پر اسے خود فیصلہ کرنے کی جرات ہوتی ہے کہ سچ شرافت وغیرہ اچھی صفات انسان کا طرہ امتیاز ہیں اور جھوٹ اور کمینگی وغیرہ صفات بد امن انسانیت کے لیے بد نما داغ کی حیثیت رکھتی ہیں کبھی تو بلا امتیاز مذہب و ملت کا کوئی انسان بھی اول ذکر صفات کو برا نہیں کہہ سکتا اور ثانی الذکر کو اچھا کہنے کی جرات نہیں کر سکتا پس دنیا کا کوئی انسان کا کسی مذہب و ملت یا کسی دین مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو اپنے آپ کو جھوٹا کمینہ اور بے حیا وغیرہ کی صفات سے متصف کرنا نہیں چاہتا بلکہ جو لوگ معاشرہ میں انتہائی گھٹیا وار کے حامل وحامی ہوتے ہیں وہ بھی ابھی ان صفات بد کو اپنے نام کے ساتھ قطعاً پسند نہیں کرتے بغلاف اس کے ہر فرد انسانی اول الذکر صفات کا لیبل اپنے نام سے چسپاں کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے خواہ وہ کردار کے لحاظ سے اس کا حل نہ بھی ہو تو اس فطرت کے فیصلے کے بعد اس نظریہ تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں کہ بقاء و ارتقاء انسانیت کے لئے پروردگار عالم کی جانب سے جو آئین فطرت مقرر ہے اس کے پاسبان بھی اس کی جانب سے ہوں۔اور اس آئین کی جملہ شقوق و جملہ شعبہ جات پر عملی طور پر اقدام کرنا اور مفصل طور پر زندگی کی تشکیل کرنا بھی اسی آئین کے ماتحتوں اور موافقت یا مخالفت کی صورت میں بعض کے لیے عدالت کا قیام بھی ہوں۔ چونکہ دنیا میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص کو صفات حسنہ کی اچھی جزا نہیں ملتی اور ہر بری صفات کے حامل و حامی کو کو اس کی سزا ملتی ہے پس اگر خالق کائنات کی جانب سے باز پرس اور جزا و سزا کا کوئی دن مقرر نہ ہو تو تخلیقی کائنات کا سارا کارنامہ بازیچہ اطفال رہ جائے گا اور اچھی صفات کی اچھائی اور برائی صفات کی برائی صرف تعلقہ لسانی تک محدود ہو گی جس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔

**قیامت حق ہے:**

اس میں شک نہیں کہ انسان میں اچھی صفات اچھائی انسان اور بری صفات کی برائی کا نظریہ صرف اسلام ہی کا پیش کردہ نہیں ہے بلکہ یہ نظریہ انسان کے اس احساس و شعور کے نتائج میں سے ہے جو حیوان کے مقابلے میں اس کا طرہ امتیاز ہے۔ البتہ عملی میدان میں اسلام سختی سے اس کی پابندی چاہتا ہے کہ جذبات و خواہشات کی رو میں بہہ کر آتے ہوئے صفات بد کو اپناتے ہوئے صفات خیر سے کنارہ کشی کی جرات نہ کی جاسکے کیونکہ جس طرح یہ غلط روش انفرادی طور پر انسانوں کو گھٹیا پن کی طرف دھکیلتی ہے اس طرح تمام انسانوں کی اجتماعی تمدن زندگی بھی اس سے بری طرح متاثر ہوتی ہے بس کائنات کا خالق و مدبر جس نے انسان کی گہری تخلیق میں امتیاز حق و باطل اور اختیار خیر و شر کی قوتیں فرمائیں اور بعض صفات کی خوبی اور بعض اوصاف کی برائی کو پرکھنے کے لیے جو ہر عقل عطا کرکے انسان ان کو جملہ مخلوقات پر یک گو فوقیت و برتری کرامت فرمائیں وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے صفات حسنہ کا عامل اور صفات بد سے پرہیز کرتے ہوئے انفرادی و اجتماعی زندگی میں اعلی کردار کا حامی ہو۔

لہذا تحریک اسلامی کے منشور میں کے توحید کے عقیدہ کے بعد قیامت پر ایمان کا عقیدہ نہایت غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے جو شخص اللہ تعالی کو حاکمِ اعلیٰ مانتا ہے اسے یہ بھی ماننا چاہیے کہ اللہ تعالی کے مقرر کردہ آئین ودستور جس میں نیک صفات کو اپنانا اور پرہیز کرنا انسان کا فطری و خلقی فریضہ ہے کہ باز پُرس کے لئے اسی اللہ تعالی کی جانب سے ایک عدالت کا دن مقرر ہے جس میں مجرم کو سزا دی جائے گی اور اطاعت گزار کو مزید انعام سے نوازا جائے گا۔

اگر نظریے قیامت سے انحراف کیا جائے اور تمام انسانوں کو وبال سمجھا جائے تو صرف حقیقت حسن کا حسن اور صفاتی بد کا کبھی لسانی فرق ق محدود ہو کہ رہ جائے گا نیز زبانِ زد عام عوام فقرہ حق بول بالا اور باطل کا منہ کالا کی حیثیت بھی باطل فرقہ نقطہ ہی محدود رہ جائے گی اور نیک و بد اور شر سکون کی انقلابی دعوت میں موثر اقدام کا ضامن ہے۔

**:اللّہ کی حاکمیت**

وجود کائنات میں فطرت کا طرز عمل یہ ہے کہ ہر ادنیٰ علی کے سامنے سرنگوں ہے اور ادنی اعلی کا فرق کسی نہ کسی امتیازی صفت کے وجود و عدم پر موقوف ہے یعنی جس میں صفت کمال موجود ہے وہ اعلی ہے اور جس جو اس سے عاری ہے وہاں دنیا ہے بس جمادات ہیں کہ ہر آنے والی علی انگوری کے قوائے نامہ سے اپنے مزاج کے مطابق وہ مناسب غشا حاصل کر سکتی ہے اور نباتات اور حیوانات کا حق حکومت ہے کیونکہ جس طرح جمادات عت قوت و نشونما محروم ہونے کی بنا پر ادنیٰ ہیں اور اپنے سے اعلی ںباتات کی خدمت پر مجبور ہیں اس طرح نباتات رکھنے کے بعد شعور حرکت کی دولت سے محروم ہیں ہیں لہذا حیوانات سے محرومی کے پیش نظر انسان کے محکوم ہیں اور انسان پر اس لیے حکم ہے کہ وہ اس پر جوہر نورانی سے بہرہ اندوز ہے جس میں خیر و شر اور نیکی و بدی کے پرکھنے کی قوت ودیعت کی گئی ہے بس اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کائنات کے جملہ موجودات میں سے سے حکومت حضرت انسان کے سر پر رکھا گیا ہے لیکن انسان کو جس جوہر نورانی کے ماتحت خیر و شر کے پرکھنے کی اہلیت و دیگر باقی موجودات پر اشرف عزوجل افضل قرار دیا گیا ہے اگر یہ انسان اس جوہر سے فائدہ نہ اٹھائے اور خیر و شر میں فرق نہ کرے یا تفریق نہ کرے اس کے باوجود اچھی صفات کو اپناتے ہوئے صفات سے اجتناب نہ کرے تو نظم و ضبط کے پیش نظر اس کے اوپر ایک حکومت بالا کا ہونا ضروری ہے جو اس سے باز پرس کرسکے اور اس کے لیے ایک لائحہ عمل تشکیل کر کے اس کو اپنی شان کے مطابق زندہ رہنے کی پیشکش کرے ورنہ اگر جو ہر عقل کی موجودگی کے باوجود بھی انسان کو آوارگی کی کھلی چھٹی ہو تو عقل کے باوجود وعدم میں کوئی فرق نہ رہے گا اور حیوان وہ انسان میں امتیاز کرنا بے مقصد ہو گا بس خالق حکیم نے اسلامی منشور کے ذریعہ سے انسانوں کو عقلی مقتضا کے ماتحت اچھی صفات کو اپنانے اور صفاتِ بد سے اجتناب کرنے کی دعوت دی تاکہ تمدنی زندگی امن و اطمینان اور سکون اور دلجمعی کا مقدس گہوارا ہو اور اس سے باز پرس کا ایک دن مقرر فرمایا تاکہ انسان اپنا اختیار و ارادہ سے انسانیت کے اوج کمال پر پہنچنے کی سعادت حاصل کریں اور جہنم کے بھیانک انجام سے خبردار رہ کر اپنی غلط کاریوں سے امن عالم کی تباہی کی جرات نہ کر سکیں اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انسانوں میں اچھی صفات یا بری صفات کا فرق اسلام نے مقرر نہیں کیا بلکہ صفات کی اچھائی یا برائی فطرت انسانی کا حصہ ہیں جن کی بدولت انسان و حیوان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اسلام تو درکنار کسی بھی دین کے پابند نہیں ہیں وہ بھی سچ کو اچھا اور جھوٹ کو برا اور ظلم کو برا جانتے ہیں۔ وعلی ہزالقیاس۔

پس دعوت اسلامی تو انسانوں کے لیے انہیں انسانی خطوط پر معاشرتی نظم نسق نظام قوانین وضع کرنے اور ان پر عمل کرنے کی تحریک کا منصوبہ ہے۔

خداوند کریم نے حیوانات بلکہ جملہ موجودات پر انسان کی حاکمیت قائم کی ہے کہ اس کو دولت عقل و سلیم سے سرفراز فرمایا ہے اور عقل و علم کو جہالت و بے عقلی پر کنٹرول ضبط کا حق عطا فرمایا ہے تو جب انسانی عقول اپنی امتیازی حیثیت کو نظر انداز کرکے حیوانات کے راستے پر گامزن ہو جائیں اور صفات خیر و شر میں تمیز نہ کر سکیں یا صرف خیر کو اپنانے کی عملی جرات نہ کر سکیں تو ان کے لئے کسی موثر علاج کی ضرورت ہے میں تو چونکہ عقل نہیں تھی لہذا ان پر کنٹرول کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا پس ان کو فساد سے بچانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کے گلے میں رسہ یا پاؤں میں زنجیر یا ناک میں نکیل یا منہ میں لگام ڈال کر اس کی شرارت پر پہرا بٹھا دیا جائے لیکن اس طرح کی غلامی چونکہ عقل و ادراک کے پیش نظر اس کی صحیح فطری آزادی پر ڈاکا ڈالنے کے مترادف ہے لہذا انسان سے جو طاقت ہی اسے حق حاصل ہے کہ انسانی نظم و ضبط کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے پس جس طرح انسان حیوان پر بالا و فوق ہونے کی حیثیت سے اس پر ضبط کا حق رکھتا ہے اس طرح خالق مدبر انسانی خدمت کے لیے آئین و قانون کے وضع کرنے اور انسان کو ان کی حدود میں پابند کرنے کا حق رکھتا ہے اور غلطی پر خصوصا وہ غلطی جو پورے معاشرہ انسانی امن کے لیے تباہی کی باعث ہو وہ سزا دینے کا حق رکھتا ہے جس طرح کے اچھے کردار پر اچھے لوگوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرما نا اس کی شان خداوندی ہے بس اس کی جانب سے جزا و سزا کے لئے مقرر کردہ دن کا نام قیامت ہے اور اللہ تعالی کو اس دن کے فیصلوں اور حکومت پر پوری قدرت حاصل ہے۔

حیوان میں صنفی طور پر تصادم کے امکانات نہیں ہیں اور اگر ہیں تو بہت کم ہیں اور وہ بھی دیرپا نہیں کیونکہ ایک نوع کے دو حیوان اگر کسی شے پر طمع و لالچ کی نگاہ ڈالیں تو ان کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش ضرور کریں گے لیکن ایک دوسرے کی کامیابی کے بعد دوسرا اپنی ناکامی کو اپنا مقدر سمجھ کر صبر کر کے خاموشی اختیار کر لیتا ہے نا کہ اس میں غصہ و کینہ دیرپا ہے اور نہ دشمنی کے جذبات کی آگ اس کے اندر شعلہ زن ہے۔ پس ان کا معاملہ وہیں کا وہیں ٹھپ ہو جاتا ہے لیکن حضرت انسان میں اس قسم کے اختلافات جذباتی تصادم کا باعث بنتے ہیں جو غیظ و غضب حسد و کینہ اور دائمی کدورت اور دشمنی کا پیش خیمہ بن کر امن و سکون کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں لہذا انسان کو آئین اور قانون کی سخت گرفت میں پابند کرنے کی ضرورت ہے لیکن قانون و آئین کی وجہ اس طاقت کے قبضہ میں ہوں جو انسانی جذبات سے بلند ہو پس اللہ تعالی کا قانون ہی انسانوں کو غلط روی سے بچا سکتا ہے اور بس۔

حیوان مختلف الانواع ہونے کے باوجود زندگی کا جملہ شعبوں میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں نہ تمدن کی خواہش ہے نہ ضرورت ہے وہ شخصی زندگی کے شعور کے ماتحت اپنے پس و پیش کا جائزہ لیتے ہیں لہذا انہیں اجتماعی بندشوں سے مکمل طور پر بے نیازی حاصل ہے لیکن بخلاف اس کے حضرت انسان تمدن کے بغیر نہیں رہ سکتا انسانوں کی زندگی کے اکثر و بیشتر امور ان کی اجتماعی زندگی سے وابستہ ہیں پس ان انسان اپنی زندگی کے جملہ شعبوں میں اپنے عقل و فکر سے اجتماعی زندگی میں اپنی عزت و وقار کے اسباب سوچتا ہے لہذا جلب منفعت اور کوفع مغفرت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا اس کی تمدنی زندگی کے واجبات میں سے ہے۔

پس خواہشات و جذبات کے اختلاف کی صورت میں باہمی تصادم ناگزیر ہے جو حاکم بالا کی قانونی گرفت کے خوف سے ہی رُوبا اعتدال اور مائل متوازن ہو سکتا ہے نیز مختلف انواع الحیوانات میں قوت و توانائی کی تقسیم یکساں نہیں ہے بلکہ خالق حکیم کی قدرت و حکمت اور ارادہ و مشیت کے پیش نظر بعض الانواع طاقتور اور دوسری کمزور اور بعض درندہ صفت اور بعض بے ضرر موجود ہیں چنانچہ شیر و بکری بھیڑیا اور بھیڑ اور شاہین و چڑیا کیسی مختلف الاقسام مخلوق ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اگر یہ سوچا جائے کہ حیوانات سب کے سب ایک سطح پر طاقتور شاہین و شیر ہوتے یا سب کے سب ایک ہی طریقہ سے بھیڑ بکری کی طرح کمزور ناتواں ہوتے تو یہ فطرت کے ساتھ کھلی ہوئی بغاوت اور مشیت پروردگار کے مقابلے میں اعلان جنگ ہے قطع نظر اس سے کہ عقل اس کو کہاں تک قبول کرتی ہے بس قادر مطلق نے اقتدار کے تخلیق سے طاقتوروں کی طاقت پر قہری مسلط کر دی جس سے کمزور مخلوق اپنے سے طاقتور درندوں کی زَد سے محفوظ چلی آتی رہی چنانچہ بعض کمزور حیوانوں کو کو انسانی آبادیوں سے مانوس کر دیا جہاں طاقتور درندوں کے لیے پہنچنا مشکل ہوگیا اور جو کمزور حیوان چلے آئے ان کو طرز رہائش اس قسم کی عطا کہ وہ طاقتوروں کے چیرہ دستیوں سے محفوظ ہوگئے۔ پس حیوانی زندگی میں عدم فساد خالق عالم کے قہری و جبری کا قانون ہے فطرت کا مرہون منت ہے اس وہ اللہ تعالی جو حیوانی ہیجانات اور درندگی کے جذبات پر اپنی گہری احکام مسلط کر کے قبضے کے لیے امن بحال کرکے ان کی زندگیوں کو محفوظ کر سکتا ہے ہے اسی خدا کو حق حاصل ہے کہ انسانوں میں طاقتوروں اور کمزوروں کو طاقتور کمزور رہتے ہوئے قانون و آئین کی اس طرح پابندی کرے کہ طاقتور طاقت کے باوجود کمزور پر دست تعدی دراز نہ کرسکے اور کمزور، کمزور رہتے ہوئے بھی طاقتور سے خوفزدہ نہ ہوں اور مدن زندگی میں اجتماعی نظام حیات سے ہر وہ پوری طرح استفادہ کر سکیں اور زمین خلق میں فساد خون ریزیوں سے محفوظ رہ سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اس عقولِ انسانیہ نے تسخیر کائنات میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اس کی تسخیر کا دائرہ عمل قوائے ارضیہ تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اس کے میں تو قضا آسانی میں بھی عقولِ انسانیہ کی فتوحات جھنڈے نصب کیے جارہے ہیں چاند تک رسائی کے بعد مریخ تک کے لیے انسانی دماغ میں جذبہ تسخیر کارفرما ہیں لیکن تسخیر عالم کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کے ساتھ ساتھ خود انسانوں میں بے راہ روی کا رجحان بھی روز افزوں نظر آتا ہے۔ کیا انسان کو اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جہاں دوسری قوتوں کو مسخر کرنے کا مجھے حق حاصل ہے اسی طرح میرے اوپر ایک قوت بالا بھی ہے جسے حق حاصل ہے کہ مجھے اپنا مسخر اور مطلع بنا لے؟

انسان چونکہ کے ہر عقل کی نعمت اپنے پاس رکھتا ہے لہذا تمام پر قوتوں پر انکی تسخیر کی کمندیں ڈال سکتا ہے جو نعمتِ عقل سے محروم ہیں اور ان میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جو انسانی عقل پر تسخیرکا کمند ڈال سکے پس انسان کی عقل اس کے سامنے جھک سکتی ہے جس کے سامنے یہ عاجز آجائیں اور وہ صرف خالق کائنات کی ذات ستودہ صفات ہے چنانچہ اس عللِ و اسباب کی دنیا میں صاحبان بصیرت اور ارباب عقل تجربہ کر چکے ہیں اور کرتے رہے ہیں کہ بسا اوقات عللِ و اسباب کی فراوانی کے باوجود نتیجہ خلاف توقع ظاہر ہوتا ہے مثلا جس عقدہ لایخل کا تدبیر کے ناخنوں سے کھل جانا قرین قیاس ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس میں مزید پیچیدگیاں رونما ہوجاتی ہیں اور انسان جہاں اپنی تدبیر کی کامیابی پر سو فیصدی یقین رکھتا ہے وہاں سو فیصدی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کو جہاں ایک دوائی کے استعمال کے بعد مریض کی تندرستی کا یقین ہوتا ہے بعض اوقات وہی دوائی اسی مریض کے لیے خلاف توقع جان لیوا بن کر ڈاکٹر کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے اور بعض اوقات جہاں ایک دوائی کے مضر ہونے کا خیال ہوتا ہے وہ مریض کے لیے پیغام شفا لاتی ہے اور ایک کثیر التعداد فوج کے بھرپور حملے کے بعد جہاں اور عروس کامیابی سے ہمکنار ہونے کے خواب دیکھے جاتے ہیں وہاں ناکامی کا سامنا ہوتا ہے اور جہاں اپنی قلت و بے بضاعتی کے پیش نظر اپنی شکست کا احساس دامن گیر ہوتا ہے وہاں کامیابی و کامرانی بڑھ کر قدم چوم لیتی ہے تو اس اسباب کی بناء پر عقول انسانیہ کے یقینی وحتمی فیصلوں کے خلاف نتیجے کا ظاہر ہونا اس پر امر کو ظاہر کرتا کہ انسانی عقولِ مافوق ایک قوت قاہرہ موجود ہے جس کا اس پوری کائنات پر مکمل کنٹرول کرتی ہے وہ متوقع کامیابی کو شکست سے صحت کو بیماری سے عزت کو ذلت سے اور طاقت کو کمزوری سے بدلنے پر پوری قدرت رکھتی ہے اور انسان خود بسا اوقات اپنی ذہنی شکست اور عقلی پسماندگی سے متاثر ہو کر ایک قوت قاہرہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتا ہے پس اسی اللّہ کی حکومت ان کی عقولِ پر کنٹرول کرنے کے اہل ہے اور اسی کا اقتدار ان